اور ایک نیا دور پیدا ہو جس میں اقوام عام میں تشدد کی نئی شکلیں غلبہ پا جائیں۔

ا سیموئیل پی ہنٹنگٹن ہارورڈ یونیورسٹی میں پروفیسر اور درج ذیل کتاب کے مصنف ہیں: *The Clash of Civilzation and the Remaking of World Order*
[*Simon and Schuster, 1996.*

اسلام اور آخری معرکۂ عظیم

ابو الراوندی *

ترجمہ: عرفان محمود

اچانک ہی یوں محسوس ہونے لگا ہے کہ جیسے ہر کوئی اسلام کا ماہر ہے۔ صدر اور وزیر اعظم سے لے کر عام افراد تک، سب ہی یہ بتانے کے لیے بے چین نظر آتے ہیں کہ حقیقی اسلام کیا ہے۔ اگر یہ علم غیر پسندیدہ ناصحین کے لیے اتنا ہی سہل الحصول ہے تو یہ حیرت کی بات ہے کہ اس موضوع پر اتنی زیادہ غلط آراء پائی جاتی ہیں۔ برطانوی وزیر اعظم ٹونی بلیئر بظاہر اس بارے میں اتنا زیادہ جانتے ہیں کہ وہ بڑے اعتماد کے ساتھ یہ اعلان کر سکتے ہیں کہ جو بھی مسلمان ان کے اپنے تصور اسلام سے مختلف نظریہ رکھتا ہے، وہ صحیح یا معیاری مسلمان نہیں ہے۔ اس تصور کے مطابق حقیقی مسلمان دراصل انگلستان چرچ کے ممبروں ہی کی طرح ہوتے ہیں: نرم و شیریں، خود کو صرف اچھا ہمسایہ ثابت کرنے کی طرف راغب، ''بین المذاہب مکالمے'' میں مصروف اور غالباً نیو لیبر پارٹی کو ووٹ دینے والے!

اسلام کے بارے میں صحیح فکر (right thinking) کے خود ساختہ سرپرست ہمیں بار بار یہ بتانے میں مصروف ہیں کہ یہ تشدد و جارحیت کی بجائے امن و محبت کا مذہب ہے۔ کیا قرآن میں ہر باب کے آغاز میں یہ نہیں لکھا ہوتا کہ: ''رحیم اور مہربان خدا کے نام سے؟'' کون اس سے اختلاف کر سکتا ہے؟ کیا تمام شائستہ اور معقول لوگ یہی جذبہ و خیال نہیں رکھتے؟ قرآن پہلے ہی برطانوی وزیر اعظم کے شبینہ مطالعے کی ایک پسندیدہ کتاب ہے جس کا اظہار انہوں نے امریکہ کے ایک حالیہ دورے کے موقع پر قدرے تفاخر کے ساتھ کیا ہے۔

کیا اعلیٰ دفتروں میں بیٹھنے والے لوگ اتنے احمق اور بے وقوف ہو سکتے ہیں؟ بظاہر اس کے لیے یہ

* Ibn al-Rawandi, "Islam and Armageddon", *Free Inquiry*, Spring 2002, Buffalo, pp. 36-38.

ایک لازمی اہلیت ہے کیونکہ اعلیٰ عہدوں پر فائز لوگوں کے لیے یہ زیادہ آسان ہوتا ہے کہ وہ اپنی اخلاقی برتری کے اظہار کے لیے ایسی احمقانہ باتیں تواتر کے ساتھ کریں۔ لیکن اختلافی آوازیں کہاں گئیں؟ وہ لوگ کہاں ہیں جو ان عہدے داروں سے مشکل مشکل سوالات کرتے ہیں؟ ممکن ہے وہ اس حماقت کا پردہ چاک کر سکیں۔ کیونکہ یہ سیدھی سادی حماقت نہیں تو اور کیا ہے؟ یقیناً ٹیلی ویژن پر انٹرویو کرنے والے اور وہ صحافی تو ایسا نہیں کر سکتے جنہیں اپنی ذاتی ترقی عزیز ہے۔ بہرحال وہ اس موضوع سے متعلق ان سے زیادہ کچھ جانتے بھی نہیں ہیں جن کا وہ انٹرویو کر رہے ہوتے ہیں۔ وہ پوری پوری کوشش کرتے ہیں کہ خود کو ''متحمل مزاج''، ''بردبار'' اور ''روادار'' بنا کر پیش کریں کہ کہیں خود ان کے اپنے ساتھ کوئی گڑ بڑ نہ ہو جائے۔

یہاں چند سوالات ہیں جو اسلام کے کسی بھی وکیلِ صفائی کے سامنے رکھے جا سکتے ہیں:

۱- اگر حقیقی اسلام صرف امن و محبت ہی پر مبنی ہے تو اس نے تاریخ میں ایسی سلطنت کس طرح حاصل کر لی جو اسپین سے ہندوستان تک پھیلی ہوئی تھی؟ کیا محض نرم و شیریں استدلال کے ذریعے؟

۲- اسلام کب اپنی ان جارحیتوں پر معذرت کرے گا جو اس نے مشرق وسطیٰ سے یونانی/مسیحی تہذیب کی بساط لپیٹنے، ۱۴۵۳ء میں قسطنطنیہ پر قبضہ کرنے اور ۱۵۲۹ء میں ویانا کا محاصرہ کرنے کے دوران انجام دیں؟

۳- اگر قرآن تمام کا تمام امن و محبت کے مضامین سے عبارت ہے تو ان آیات کی وضاحت کیسے کی جائے گی:

> ''وہ لوگ جو اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں انہوں نے اپنی زندگیاں آخرت کے بدلے میں بیچ دی ہیں۔ جو اللہ کے لیے لڑتا ہے، خواہ وہ مارا جائے یا فاتح ہو، جلد ہی ہم اسے ایک بڑا انعام دیں گے''۔ (۴:۷۴)
>
> ''وہ جو ایمان لائے، اللہ کی راہ میں لڑتے ہیں اور جو کافر ہوئے، وہ شیطان کی راہ میں لڑتے ہیں''۔ (۴:۷۶)
>
> ''اے ایمان والو، یہودیوں اور عیسائیوں کو اپنا دوست نہ بناؤ، وہ دراصل ایک دوسرے کے دوست ہیں۔ تم میں سے جو انہیں دوست بناتا ہے وہ انہی میں سے ہے۔ خدا بے

انصاف لوگوں کی رہنمائی نہیں کیا کرتا''۔(۵:۵۴)

''ان سے لڑو جو نہ خدا پر ایمان لاتے ہیں نہ آخرت پر، نہ جس سے خدا اور رسول نے منع کیا ہے باز آتے ہیں اور نہ دین حق کو تسلیم کرتے ہیں، چاہے یہ لوگ اہل کتاب ہی کیوں نہ ہوں، جب تک وہ جزیہ نہ دیں اور عاجز بن کر نہ رہیں''۔(۹:۲۹)

''جب تم کافروں سے ملو، ان کی گردنیں مارو، پھر جب تم اچھی طرح ان کی بڑی تعداد قتل کر چکو تو انہیں مضبوطی سے باندھ دو، پھر انہیں آزاد کر دو چاہے احسان کر کے یا تاوان وصول کر کے، یہاں تک کہ جنگ ختم ہو جائے''۔۴:۴۷

یہ سمجھنا مشکل نہیں کہ جو لوگ قرآن کو خدا کا کلام مانتے ہیں، کس طرح ایسی آیات میں ہر طرح کی قابل تصور دہشت گردی کے لیے جواز پا لیتے ہیں۔ جب اس طرح کے قرآنی متن ان وکلاء صفائی کے سامنے پیش کیے جاتے ہیں تو ان کا عام طور پر ردعمل یہ ہوتا ہے کہ یہ قرآن کے ناقص تراجم ہیں، ان کا عربی متن بالکل مختلف ہے اور ایسی آیات کی تلافی بعض دوسری بہتر آیات کے ذریعے کر دی جاتی ہے۔ بدقسمتی سے، وحی کے بارے میں مسلم روایات یہ ہیں کہ ابتدائی متون بعد میں نازل ہونے والے متون کے نتیجے میں منسوخ ہو چکے ہیں اور جارحیت پر اکسانے والی تمام آیات ''مدنی'' ہیں جبکہ نرمی اور صبر کی داعی آیات ''مکی'' یعنی ابتدائی زمانے کی ہیں۔ یہ بھی کہا جاتا ہے کہ قرآن کی اس آیت: ''مشرکین کو قتل کرو جہاں کہیں انہیں پاؤ'' نے ان ۱۲۴ آیات کو غیر موثر کر دیا ہے جن میں نرمی اور برداشت کی تعلیم دی گئی ہے۔

اسلام میں کوئی پوپ اور کوئی ایسی حتمی اتھارٹی نہیں جو بتا سکے کہ حقیقی اسلام کیا ہے؟ اور قرآنی متون کی صحیح تعبیر کیا ہے؟ تعبیر و تشریح کے حوالے سے عملاً بے شمار آراء پائی جاتی ہیں۔ وہ لوگ جو مذکورہ بالا قرآنی آیات سے آراستہ سرخ رومال سر پر باندھے ۱۱ ستمبر جیسے واقعات میں ملوث ہوتے ہیں، خود کو اچھا مسلمان سمجھنے کا ہر طرح سے حق رکھتے ہیں، جو خدا کا کام انجام دے رہے ہیں اور آخرت میں انعام کے مستحق ہیں۔ بلاشبہ ایسے لوگ خود کو معیاری مسلمان تصور کرنے کا زیادہ حق رکھتے ہیں بہ نسبت ان مغربی تعلیم یافتہ اور مغربی تراش خراش کے ساتھ مسلم اداروں کی نمائندگی کرنے والے افراد کے، جو ایسے واقعات پر ہمدردی اور افسوس کا اظہار کرتے ہیں یا معصومانہ مسکراہٹ کے حامل اس صوفی کی نسبت جو ''قلب'' کے

معاملات پر بات کرتا ہے۔ آخر الذکر کا کردار زیادہ کراہت انگیز ہے، کیونکہ اس گروہ کے بہت سے اہداف عسکریت پسندوں کے ساتھ مشترک ہیں، مثلاً خلافت کا احیاء، تاہم ان میں یہ سب کچھ کرنے کی جرأت مفقود ہے۔

یہ بات اہم ہے کہ ایسی باتیں بہ بانگِ دہل اور فوری طور پر کہہ دی جائیں، کیونکہ کم از کم برطانیہ میں اس بات کا جلد ہی امکان ہے کہ ایسا مواد لکھنے اور شائع کرنے والوں کو مذہبی منافرت پھیلانے کا مرتکب قرار دے دیا جائے*۔ ایسے جذبات برطانیہ کے لبرل دانش وروں میں اتنے عام ہیں کہ ایک بڑی تعداد کا اسلام اختیار نہ کر لینا حیران کن ہے۔ اس کے برعکس، ان فکری حلقوں سے باہر کی دنیا میں یوں ظاہر ہوتا ہے کہ یا تو اسلام ہی دین حق ہے، اور ایسی صورت میں ہم سب کو مسلمان ہو جانا چاہیے، یا اسلام برحق نہیں ہے، اور اگر یہ برحق نہیں ہے تو انتہائی طور پر نامعقول ہے، چنانچہ اس کے بارے میں ایسا کہنا (جیسا اب تک کہا گیا ہے) کوئی جرم نہیں ہوسکتا۔

بلاشبہ یہاں خوف خونریزی کا ہے۔ مسلمانوں پر جسمانی حملوں کا سبب ان کا خود کو مخصوص لباس کے ذریعے نمایاں رکھنا ہے، جس کے بارے میں عام تاثر یہ ہے کہ یہ ان کے مذہب کی تعلیم ہے، بالخصوص مسلمان عورتوں کے معاملے میں۔ لیکن حقیقت میں ایسا نہیں ہے۔ قرآن و احادیث میں کہیں بھی نہیں کہا گیا کہ مسلمان عورتیں لازماً سر پر اسکارف اور لمبے بے شکل لباس پہنیں۔ صرف باحیا لباس کا تقاضا کیا گیا ہے جس کے عملاً کئی اسلوب ہو سکتے ہیں جن میں بعض مغربی ملبوسات بھی شامل ہیں۔ مسلمان عورتوں کے اسکارف پر ہنگامہ ایک بالکل بے بنیاد ہنگامہ آرائی ہے۔ اسکارف پہننا لازمی نہیں ہے۔

یہ بات کہ مسلمان عورتیں اپنے لیے اسکارف کا انتخاب کرتی ہیں، آرائش و زیبائش کے کسی بھی دوسرے فیشن کے حق میں پسندیدگی سے زیادہ اہم نہیں۔ دوسروں کے نزدیک یہ محض جہالت اور تعلیم کی کمی کا نتیجہ ہے جو کہ مسلمانوں میں وبا کی طرح عام ہیں۔ انہیں اپنے معاشروں کی طرف سے یہ باور کرایا گیا ہے کہ ایک خالص مسلمان کو یہی کچھ کرنا ہوتا ہے اور مسلمان عوام کے پاس اس کے خلاف جاننے کا کوئی

---

*اس تحریر کے وقت بلیئر حکومت کی طرف سے کسی بھی مذہبی گروہ پر جارحانہ تنقید کو حرام قرار دینے کا ایک بل پیش کیا جا رہا تھا۔ یہ بل ہاؤس آف لارڈز میں مسترد ہو گیا تھا، تاہم شاید جلد ہی اسے دوبارہ پیش کیا جائے گا۔

ذریعہ نہیں ہوتا۔ یہ چیز خاص طور پر تشویش ناک ہے کہ وضع قطع کی یہ پابندیاں لڑکیوں پر چار یا پانچ سال کی عمر سے ہی لگا دی جاتی ہیں حالانکہ قانون کا اطلاق بلوغت سے پہلے نہیں ہوتا۔ لیکن کیا ہم کسی ایسے ٹی وی صحافی کا تصور کر سکتے ہیں جو یہ ساری باتیں تعصب اور کم فہمی کی ''شکار'' مسلمان عورت کے سامنے پیش کر سکے؟ اگر اسلام صرف امن و محبت اور نیک روی کا نام ہے، جیسا کہ ہمیں بتایا جاتا ہے، تو ان چیزوں کے لیے کسی مخصوص لباس یا وضع قطع کی چنداں ضرورت نہیں۔ دراصل مخصوص لباس یا وضع قطع ایک طرح کی خودنمائی کا مظہر ہے کہ: ''مجھے دیکھو، میں کتنی باحیا ہوں، کتنی نیک، کتنی پرکشش، تمہاری بے راہروی پر جیتا جاگتا الزام، مجھے اپنی اور تمہاری بھلائی کے لیے بہر حال خود کو چھپانے کا کھیل کھیلنا ہے''۔

ہمیں مسلسل یہ بتایا جا رہا ہے کہ ہم اسلام کے خلاف کسی جنگ میں مصروف نہیں۔ لیکن اسلام کے خلاف جنگ آخر کیوں نہیں؟ دنیا کی آبادی کے اس ایک ارب حصے کے خلاف جنگ کیوں نہیں جو شب گرفتہ جہالت اور خرافات و توہم کی دلدل میں دھنسا ہوا ہے؟ اس تصور جہاں کے خلاف جنگ کیوں نہیں جو ہماری ان تمام سیکولر، لبرل، انسان دوست اور جمہوری اقدار کا مدمقابل ہے، جو ہمیں اس قدر عزیز ہیں؟ آخر کیوں نہیں؟ اس کی وجہ یہ ہے کہ مغرب انجیل زدہ احمقوں کی زیر قیادت ہے جن کی خوش خیالیوں میں ایک ان کا یہ زعم ہے کہ وہ حقیقی اسلام کا ادراک رکھتے ہیں، دوسری طرف ان کے یہ خواب ہیں کہ مغرب خدا سے ڈرنے والا، انجیل کا مطالعہ کرنے والا، چرچ سے وابستہ رہنے والا اور احمقوں کی طرح ہنسانے والے ان گروہوں کی سرزمین ہو جن کی سب سے اعلیٰ قدر دنیا کے اسٹیج پر جتنا طویل عرصہ ممکن ہو، اتراتے اور اکڑتے رہنا ہے۔ ایسے لوگوں کی بہ نسبت، یہ ہائی جیکر ہیرو دکھائی دیتے ہیں!

ہمیں بتایا جاتا ہے کہ ۱۱ستمبر کے واقعات تہذیبوں یا نظریات کا تصادم نہیں ہیں، حالانکہ یہ واقعات بالکل یہی کچھ ہیں۔ یہ کوئی اتفاق نہیں ہے کہ ورلڈ ٹریڈ سنٹر کے دو ٹاور سب سے پہلے نشانہ بنے۔ دراصل بہت سے مسلمان یہ سوچ رکھتے ہیں کہ بلند و بالا عمارتیں ملحدانہ غرور، نخوت اور خدا سے سرکشی کی علامتیں ہیں اور قرب قیامت کی نشانیوں میں سے ہیں۔ اس حقیقت نے بھی ان ٹاوروں کی زمین بوسی پر مسلمانوں کے اطمینان و مسرت میں اضافہ کیا ہے کہ یہ یہودیوں اور عیسائیوں کی اس سودی تجارت اور معاشی طاقت کی علامت ہیں جس کے ذریعے سے مسلم دنیا کا استحصال کیا جاتا ہے۔ بالخصوص جبکہ انہیں منہدم کرنے میں

صرف دس ہی جانوں کی قربانی دینا پڑی۔ باقی یہ کوئی تشویش طلب امر نہیں کہ حملے کے وقت ورلڈ ٹریڈ سنٹر میں مسلمان بھی موجود تھے کیونکہ ان کی تقدیر مذکورہ بالا قرآنی آیات (۹:۲۹، ۵:۵۴) کے تحت پہلے ہی متعین کر دی گئی تھی۔

افغانستان پر حملے کا سبب اور مقصد ''انصاف'' قرار دیا جاتا ہے گویا کہ اس لفظ کے مفہوم پر کوئی بین الاقوامی اتفاقِ رائے طے پا چکا ہے۔ اس حوالے سے صرف یہ پوچھا جانا چاہیے کہ: ''کس کا انصاف، میرا یا آپ کا، ہمارا یا ان کا، انسانوں کا یا خدا کا''؟ بین الاقوامی قانون میں کتنی کچھ شریعت موجود ہے؟ اس قانون نے کہاں سے جنم لیا، اسے کس نے اور کس مقصد کے تحت مرتب کیا؟ یہ کس دنیا سے آیا؟ کیسی دنیا یہ بنانا چاہتا ہے؟ یقیناً یہ دنیا بادشاہانہ خلافت کی نہ ہوگی جہاں مسلمانوں کا انصاف تقریباً چودہ سو سالوں تک غالب رہا۔

کہا جاتا ہے کہ امریکہ اور افغانستان پر کیے گئے دونوں طرح کے حملوں میں یہ خرابی ہے کہ ان میں معصوم زندگیاں ہلاک ہوتی ہیں، مگر کون ہے جو ایسے موقعوں پر معصوم جانوں کی قربانی نہ دینا چاہے گا جبکہ ایسا کرنا ان کے لیے موزوں ہو؟ اہل مغرب نے ۱۹۱۴ء سے ۱۹۴۵ء کے درمیانی عرصے میں صرف یورپ میں ایک سو ملین عام شہریوں کو، ایک یا دوسرے جواز کے تحت، زندگی کے حق سے محروم کیا۔ ہلاکتوں کی یہ تعداد مقاصد کے حصول میں جدید ٹیکنالوجی کے استعمال کا نتیجہ ہے۔ اس سے پہلے بھی ایسے مقاصد پائے جاتے تھے مگر اس وقت لوگوں کی اتنی بڑی تعداد کو قتل کرنا ممکن نہ ہوتا تھا۔ لیکن اب مقاصد پر یقین ہی کون رکھتا ہے؟ حتیٰ کہ جدید مسلمانوں کی اکثریت بھی مقدس جہاد کے نام پر گردنیں کٹوانے کو تیار نہیں۔ بیشتر اہل مغرب کی طرح، ان مسلمانوں کا مطمحِ نظر بھی دولت، جنس اور ایسی آسودہ حال زندگی ہے جس کے ساتھ تھوڑے سے مذہب کا ضمیمہ بھی گروہی تشخص، تسلی و تشفی اور ممکنہ طور پر آئندہ زندگی میں بہتر مستقبل کی ضمانت کے لیے لگا ہو۔ مذہب نے اب تک اپنا وجود برقرار رکھا ہے اور غالباً ہمیشہ برقرار رکھے گا، اس وجہ سے نہیں کہ یہ حق ہے بلکہ اس وجہ سے کہ انسان جذباتی لحاظ سے غیر متوازن ہیں۔

بہرحال ہمیں جنگ کی ضرورت ہے کہ ایک پرامن عالمی ماحول ذہنوں پر جمود طاری کرنے اور ٹھٹھرا کر رکھ دینے والا ہوگا۔ شاید اسامہ اور اس کے ساتھی اور کئی افراد کی طرح ترگنیف (Turgenev)